ریاستوں کی ایک کے بعد دوسری کی باری ہے۔ مسلم ملکوں میں وہ اپنے کرایہ کے ایجنٹوں کے ذریعہ افرا تفری اور انتشار پیدا کرنے کے حربوں میں لگا ہوا ہے۔ پاکستان اور سعودی عرب اس وقت خاص طور پر ٹارگیٹ ہیں۔

ان حالات میں اہلِ اسلام کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ان کو وہ خود متعین کریں اور ان کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ ان میں سب سے پہلی ترجیح امت میں اتحاد اور یکجہتی پیدا کرنا، ان کو ایک نصب العین پر جمع کرنا، جہاد کا جذبہ بیدار کرنا اور اخلاقی اقدار کو مستحکم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو لوگ جدوجہد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی غیب سے نصرت فرماتے ہیں اور یہ نصرت الٰہی اہلِ ایمان کے لئے عنقریب ظاہر ہوگی۔ اندھیرا جب آخری حد تک پہنچتا ہے تو سحر کے آنے کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ **الیس الصبح بقریب۔**

معاشرے کی تعمیر

آج کے دور میں جو بھی استحصال، لوٹ مار، بے انصافی، بدعنوانی اور انسانیت کی تحقیر و تذلیل کی صورتیں پیدا ہوچکی ہیں، ان کے خلاف انقلابی انداز میں عوام کو برسر پیکار کیا جائے اور اشرافیہ طبقہ کو منہدم کیا جائے۔ اس کے بعد ہی حریّت، مساوات اور عدل پر مبنی معاشرہ کا قیام ممکن ہے۔ قانونِ قدرت ہے اور عالمی حقیقت بھی کہ جب تک تخریب کی صورتوں کو مسمار نہ کیا جائے، ارفع اصولوں پر معاشرے کی تعمیر ناممکن ہے۔

تصوف کے چار دور اور بیعت کی حقیقت

مجھ فقیر کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ تصوف کے طریقوں میں اب تک چار بڑے بڑے تغیرات ہو چکے ہیں۔

۱۔ تصوف کا پہلا دور: رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک اہل کمال کی بیشتر توجہ زیادہ تر شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف رہی۔ ان لوگوں کو باطنی زندگی کے جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل ہی میں حاصل ہوجاتے تھے۔ چنانچہ ان بزرگوں کا "احسان" یعنی حاصلِ تصوف یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے، ذکر اور تلاوت کرتے تھے، روزے رکھتے تھے، صدقہ اور زکوٰۃ دیتے تھے اور جہاد کرتے تھے۔ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو سرنیچے کیے بحرِ تفکرات میں غرق نظر آتا۔ خدا تعالیٰ سے قرب وحضوری کی نسبت اعمالِ شریعت اور ذکر واذکار کے سواہ کسی اور ذریعے سے حاصل سعی نہ کرتے۔ بے شک ان اہل کمال بزرگوں میں سے جو محقق ہوتے، ان کو نماز اور ذکر واذکار میں لذت ملتی۔ قرآن مجید کی تلاوت سے وہ متاثر ہوتے۔ مثلاً وہ زکوٰۃ محض اس لیے نہ دیتے کہ خدا کا حکم ہے بلکہ خدا کے حکم کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بخل کے روگ سے بچاتے۔ چنانچہ جب وہ اپنے آپ کو دنیاوی کاموں میں بے حد منہمک پاتے اور انہیں اس کا احساس ہوتا تو وہ دل کو کاروبارِ دنیا سے ہٹانے کے لئے زکوٰۃ دیتے۔ اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام بجالانے میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔

الغرض یہ بزرگ محض خدا کا حکم سمجھ کر شرعی احکام ادا نہ کرتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی شخص نہ بے ہوش ہوتا اور نہ اسے وجد آتا۔ نہ وہ جوش میں آکر کپڑے پھاڑنے لگتا اور نہ شطح یعنی خلاف شرع کوئی لفظ اس کی زبان سے نکلتا۔ یہ بزرگ تجلیات استتار اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر مطلق گفتگو نہ کرتے تھے۔ یہ بزرگ بہشت کی رغبت وآرزو رکھتے اور دوزخ سے خائف وہراساں رہتے۔ کشف وکرامات اور خوارق ان سے بہت کم ظاہر ہوتے سرمستی وبے خودی کی کیفیت بھی شاذونادر ہی ان پر طاری ہوتی۔ اور اگر کبھی کبھی یہ باتیں ان سے صادر بھی ہوتیں تو قصداً نہیں بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا۔

بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات جن کا نتیجہ کرامات وخوارق اور سرمستی وبے خودی کی قبیل کی چیزیں ہوتیں ہیں، یہ کیفیات ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوئی تھیں کہ وہ ملکہ بن جاتیں۔ چنانچہ اس ضمن میں جب کبھی ان سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی تو یا اس کی صورت یہ تھی کہ وہ جس چیز کو ازروئے ایمان صمیم قلب سے مانتے تھے، وہ چیز بے اختیار ان کی زبان پر آجاتی جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق مرض الموت میں اپنے تیمارداروں سے فرمایا تھا کہ "طبیب نے ہی مجھے بیمار کیا ہے۔" یا یہ ہوتا کہ یہ بزرگ خواب میں بعض چیزوں کو دیکھ لیتے یا فراست سے نامعلوم چیز کو معلوم کرلیتے۔ لیکن یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی ان تک رسائی نہ

ہوسکتی۔ قصہ مختصر، اس دور میں جسے تصوف یا ''احسان'' کا پہلا دور کہنا چاہئے، اہل کمال کا غالب طور پر یہی حال رہا۔

۲۔ تصوف کا دوسرا دور: حضرت جنید جو گروہ صوفیا کے سرخیل ہیں، ان کے زمانے میں یا ان سے کچھ پہلے تصوف کے ایک اور رنگ کا ظہور ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ ہوا کہ اہلِ کمال میں سے جو خواص تھے، انہوں نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ دنیا سے بالکل قطع تعلق کرلیا اور مستقل طور پر وہ ذکر وفکر میں لگ گئے۔ اس سے ان کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہوگئی اس کیفیت سے مقصود یہ تھا کہ دل کو تعلق باللہ کی نسبت حاصل ہوجائے چنانچہ یہ لوگ اس نسبت کے حصول میں لگ گئے۔ وہ مدتوں مراقبے کرتے اور ان سے تجلی، استتار انس اور وحشت کے احوال وکوائف ظاہر ہوتے، اور وہ اپنے ان احوال کو نکات اور اشارات میں بیان بھی کرتے۔ ان اہل کمال میں سے سب سے صادق وہ بزرگ تھے، جنہوں نے اپنی زبان سے وہی کہا جو خود ان پر گزرا۔ سماع سنتے سرمستی وبے خودی میں بیہوش ہوجاتے کپڑے پھاڑتے اور رقص کرتے۔ یہ کشف واشرف کے ذریعے دوسروں کے دلوں کی باتیں بھی معلوم کرلیتے تھے انہوں نے دنیا سے اپنا رشتہ توڑ کر پہاڑوں اور صحراؤں میں پناہ لی اور گھاس اور پتوں پر زندگی گزارنے اور گودڑیاں پہننے لگے نفس شیطان کے مکروہ اور دنیا کے فریبوں کو یہ خوب سمجھتے تھے۔ اور ان سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہ لوگ مجاہدے بھی کرتے تھے۔ الغرض اس دور کے اہل کمال کا تصوف یہ تھا کہ وہ خدا کی عبادت کا محرک خدا کے ساتھ ان کی محبت کا جذبہ ہوتا۔

لیکن تصوف کے اس دور میں ''توجہ'' کی نسبت اپنے درجہ کمال تک نہیں تھی۔ ''توجہ'' سے یہاں مراد نفس کا پوری طرح حقیقت الحقائق یعنی ذاتِ خداوندی کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ نفس اللہ کے رنگ میں کلیۃً رنگا جائے اور وہ دنیا کی عارضی اور فانی چیزوں پر پوری طرح غالب آجائے۔ تصوف کے اس دور میں ''توجہ'' کی نسبت دوسری چیزوں سے ملی جلی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں ان اہل کمال میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے کہ خاص ''توجہ'' کو ان معنوں میں اپنا نصب العین بنایا ہو کہ وہ ہمیشہ اسی کی بات کرتا اور اسی طرف اس کا اشارہ ہوتا یا اس زمانے میں یہ صورت ہوتی کہ ان میں سے کسی شخص نے ''توجہ'' کی نسبت حاصل کرنے کی راہ بتائی ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ ان بزرگوں پر اطاعت کا رنگ غالب تھا۔ اور اطاعت کے انوار سے وہ سرشار تھے۔ بیشک انہیں ''توجہ'' کی نسبت حاصل ہوتی۔ لیکن گاہے گاہے جیسے کہ بجلی کی چمک کہ ابھی ہے اور ابھی نہیں

شب خیال طرۂ شوخ بدل پیچیدو رفت
ساعتے ہم چوں شب قدر از برم جوشیدورفت

۳۔ تصوف کا تیسرا دور: سلطان الطریقت شیخ ابو سعید بن ابی الخیر اور شیخ ابوالحسن خرقانی کے زمانے میں طریق تصوف میں ایک اور تغیر رونما ہوتا ہے۔ اس دور میں اہل کمال میں سے عوام تو حسب سابق شرعی اوامر واعمال پر ٹھہرے رہے اور جو خواص الخاص تھے۔ انہوں نے اعمال واحوال سے گزر کر ''جذب'' تک رسائی حاصل کی۔ اس ''جذب'' ہی کی وجہ سے ان کے سامنے ''توجہ'' کی نسبت کا رستہ کھل گیا۔ اسی سے تعینات کے سب پردے ان کے لیے چاک ہوگئے۔ اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ایک ذات ہے جس پر تمام اشیا کے وجود کا انحصار ہے وہی ذات سب اشیا کی قیوم ہے۔ یعنی اس کی بدولت سب اشیاء قائم ہیں۔ یہ لوگ اس ذات میں گم ہوگئے اور اس کے رنگ میں ان کے نفوس رنگے گئے۔ چنانچہ اس حال میں نہ ان کو اور اد وظائف کی چنداں ضرورت رہی اور نہ انہیں مجاہدے اور ریاضتیں کرنے اور نفس اور دنیا کے فریبوں کو جاننے کی سدھ بدھ رہی۔ ان کی

تمام تر کوشش کا مقصد یہ ٹھہرا کہ جس طرح بھی ''توجہ'' کی نسبت کی تکمیل کریں ''توجہ کے علاوہ باقی جو نسبتیں ہیں یہ لوگ انہیں نورانی حجاب سمجھتے تھے۔ اس عہد میں توحید وجودی اور توحید شہودی میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ درحقیقت ان بزرگوں کی اصل غایت یہ تھی کہ ذاتِ الٰہی میں اپنے وجود کو گم کر کے اس مقام کی کیفیات سے لذت اندوز ہوں چنانچہ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے تھے کہ کائنات کا وجودِ الٰہی سے کیا علاقہ ہے؟ انسان خدا کی ذات میں کیسے گم ہوتا ہے؟ اور فنا وبقا کے کیا حقائق ہیں؟

۴۔ تصوف کا چوتھا دور: آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد میں ان اہل کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ کیفیات واحوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائق تصوف کی بحث وتدقیق کرنے لگتے ہیں، ذات واجب وجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی؟ ان بزرگوں نے ظہور وجود کے مدارج اور تنزلات دریافت کیے اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا۔ اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا۔ الغرض یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لئے موضوع بحث بن گئے۔

تصوف کے ان چاروں دوروں میں جو بھی اہل کمال بزرگ گزرے ہیں، گو وہ اپنے ظاہری اعمال واحوال میں الگ الگ نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک ان کی اصل کا تعلق ہے، میرے نزدیک وہ سب ایک ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ ان کے حال کو ہم سب سے بہتر جانتا ہے۔

ان بزرگوں میں سے جب کسی نے اس دنیا سے انتقال فرمایا تو جو باطنی کیفیت اس بزرگ نے اپنی ہمت اور ریاضت سے دل میں پیدا کرلی تھی۔ وہ کیفیت موت کے بعد بھی اس بزرگ نفس میں جاگزین رہی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی آئینہ یا پانی کا حوض ہو اور اس میں آفتاب کا عکس پڑ رہا ہو۔ ان بزرگوں کے طفیل مبداء اول یعنی خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ قریب ہوگیا۔ اور ان کے فیوض وبرکات کے انوار سے عالم علوی اور عالم سفلی کی فضا منور ہوگئی جیسے کہ ہماری اس آسمانی فضا میں جب مرطوب ہوا اور بادل پھیل جاتے ہیں تو اس کا اثر زمین پر بھی پڑتا ہے۔ اسی طرح نفوسِ قدسی کی کیفیات بھی دنیائے قلب پر اپنا اثر ڈالتی رہتی ہیں۔

الغرض تصوف کے یہ چاروں طریقے خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہیں۔ اور ملاء اعلیٰ میں بھی ان سب کی منزلت مسلم ہے۔ ارباب تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان بزرگوں کے ہر طبقے کے اقوال واحوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلے میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے ارباب تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔

بیعت کی حقیقت

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: **ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکث علی نفسہ ومن اوفیٰ بما عٰھد علیہ اللہ فسیؤتیہ اجرا عظیما** (اے محمدؐ! بے شک جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔ بیعت کرنے کے بعد جس نے عہد شکنی کی تو اس عہد شکنی کا وبال اس کے نفس پر ہوگا اور جس نے اپنے عہد کو جو اس نے اللہ کے ساتھ کیا تھا پورا کیا تو اللہ اس کو عنقریب بہت بڑا بدلہ دے گا) نیز مشہور احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ صحابہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کیا کرتے تھے۔ کبھی یہ بیعت ہجرت کے لیے ہوتی، کبھی جہاد

کی غرض سے۔ بعض اوقات ارکان اسلام کو پابندی سے ادا کرنے کے لئے بیعت کی جاتی۔ کبھی میدان جنگ میں کفار کے خلاف ثابت قدمی کے ساتھ لڑنے کے لئے بیعت کی صورت میں عہد واقرار ہوتا۔ اور کبھی سنت کو مضبوطی سے پکڑنے، بدعات سے بچنے اور طاعات وعبادات کو زیادہ سے زیادہ شوق رغبت سے کرنے کے لئے بھی بیعت کی جاتی تھی۔ اسی ضمن میں رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے انصار عورتوں سے مردوں پر نوحہ نہ کرنے کی بیعت کی تھی۔ ابن ماجہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فقرائے مہاجرین میں سے ایک جماعت سے اس امر کی بیعت لی تھی کہ وہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کریں گے چنانچہ ان کی حالت یہ تھی کہ ان میں سے اگر کسی کے ہاتھ سے کوڑا گر پڑتا تو خود گھوڑے سے اتر کر اسے اٹھاتا لیکن اس کے لئے کسی سے سوال نہ کرتا۔

اس بات میں تو کوئی شک وشبہ نہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ سے کوئی ایسا فعل ثابت ہو، جو آپ نے بطور عبادت کے کیا اور آپ ﷺ نے اس کے متعلق خاص اہتمام فرمایا تو وہ فعل سنت سے کم درجہ کا نہیں سمجھا جائے گا۔ اب صورت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے۔ اور اس نے قرآن میں جو کچھ نازل فرمایا، اس کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ نیز آپؐ قرآن وسنت کی تعلیم دیتے تھے، اور اپنے پیروؤں کے اخلاق سدھارتے تھے۔ چنانچہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے جو کچھ آپ نے کیا وہ بعد میں آپ کے خلفا کے لئے سنت بنا۔ اور بحیثیت قرآن اور حکمت کے معلم ہونے اور امت کے اخلاق سدھارنے کے سلسلہ میں آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا، وہ بعد میں علمائے راسخین کے لئے سنت بنا۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان امور سے بیعت کا تعلق کس سے ہے؟ اس بارے میں بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ بیعت صرف خلافت تک محدود ہے۔ اور صوفیا جو اپنے مریدوں سے بیعت لیتے ہیں، اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ خیال غلط ہے۔ اس سلسلے میں ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ نبی ﷺ کبھی ارکان اسلام پابندی سے ادا کرنے کے لئے بیعت لیتے تھے۔ اور کبھی سنت پر مضبوطی سے عمل کرنے کی غرض سے بھی بیعت لی جاتی تھی۔ خود صحیح بخاری کی یہ حدیث اس امر کی شاہد ہے کہ آپ ﷺ نے جریرؓ سے بیعت لی اور بیعت لیتے ہوئے فرمایا: ''تم پر ہر مسلمان کی خیر خواہی لازم ہے۔'' یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے انصار سے بیعت لی اور ان سے یہ شرط لی کہ وہ خدا کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ اور جہاں بھی ہوں حق بات کہیں۔ چنانچہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ امراء اور ملوک کے روبرو برملاطور پر غیر حق کی تردید اور اس کا انکار کرتے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے انصار کی عورتوں سے بیعت لی اور ان سے شرط کی کہ وہ مردوں پر نوحہ نہیں کریں گی۔ الغرض یہ سب معاملات جن کے متعلق آنحضرت ﷺ نے بیعت لی، ان کا شمار خلافت میں نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ان کا تعلق تزکیہ اخلاق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہے۔ یعنی ان روایات سے صاف ظاہر ہے کہ بیعت محض خلافت تک محدود نہیں۔

بیعت کے معاملے میں اصل حقیقت یہ ہے کہ بیعت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک بیعتِ خلافت ہے۔ اس کے علاوہ ایک بیعت اسلام بھی ہے۔ پھر تقویٰ پر مضبوطی سے قائم رہنے کی بیعت ہے۔ جہاں تک کفر سے اسلام میں داخل ہونے کے وقت بیعت لینے کا تعلق ہے یہ بیعت خلفا کے زمانے میں متروک رہی۔ خلفائے راشدین کے عہد میں تو اس لیے اس بیعت کا رواج نہ تھا کہ ان کے زمانے میں زیادہ تر لوگ غلبہ وقہر اور تلوار کی وجہ سے مسلمان ہوتے تھے نہ کہ تالیف قلوب اور دلیل وبرہان کے ذریعے سے۔ اور نہ وہ اپنی

مرضی وشوق سے اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ اس لیے ان سے اسلام قبول کرتے وقت بیعت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔باقی رہا خلفائے راشدین کے بعد کا زمانہ۔ اس میں تو بیشتر خلفا ظالم اور فاسق ہوئے جن کو سنت کے قیام کا کوئی خیال ہی نہ تھا۔ چنانچہ جس طرح بیعت اسلام زمانۂ خلفا میں متروک رہی۔ اسی طرح تقویٰ پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لئے بیعت لینے کا بھی اس عہد میں رواج نہ تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بیعت تقویٰ اس لیے متروک رہی کہ اس وقت صحابہ کثیر تعداد میں موجود تھے جنہوں نے نبی ﷺ کی صحبت سے فیضانِ نور کا اکتساب کیا تھا اور آپ کے سامنے تربیت پائی تھی۔ ظاہر ہے انہیں اس امر کی حاجت نہ تھی کہ تقویٰ پر قائم رہنے کے لئے خلفاء سے بیعت کرتے لیکن ان کے بعد جو خلفا ہوئے، ان کے زمانے میں بیعت تقویٰ اس لئے متروک رہی کہ اس سے امت میں انتشار پھیلنے کا خوف تھا۔ کیوں کہ بیعت تقویٰ پر خلافت کی بیعت کا بھی گمان ہوسکتا تھا اور اس سے فتنے اٹھنے کا امکان تھا۔ اس زمانے میں صوفیا کے ہاں یہ دستور تھا کہ وہ بیعت کے بجائے خرقہ کو اس کا قائم مقام بناتے تھے لیکن ایک وقت آیا جب خلفا میں بیعتِ خلافت کی رسم ختم ہوگئی تو صوفیا نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ وہ اپنے مریدوں سے بیعت لینے لگے اور انہوں نے اس سنت کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

اب تم پوچھو گے کہ (۱) بیعت واجب ہے یا سُنّت؟ (۲) بیعت کے مشروع ہونے میں حکمت کیا ہے؟ (۳) بیعت لینے والے کے لیے کیا شرطیں ہیں؟ (۴) بیعت کرنے والے کی کیا شرائط ہیں؟ (۵) بیعت کرنے والے کے لیے بیعت کو پورا کرنا اور بیعت کو توڑنا کیا ہے؟ (۶) کیا ایک یا ایک سے زیادہ عالموں سے ایک شخص کا ایک سے زیادہ بار بیعت کرنا جائز ہے؟ (۷) سلف سے بیعت کے کون سے الفاظ منقول ہیں؟

تمہارے پہلے سوال کا جواب کہ بیعت سنت ہے یا واجب؟ یہ کہ بیعت واجب نہیں، سنت ہے۔ اس لیے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب چاہا۔ اس ضمن میں کہیں اس بات کی دلیل نہیں ملتی کہ جس نے آپ کی بیعت نہ کی وہ گنہگار ہوا اور نہ کسی امام نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت نہ کرنے والے کو بُرا قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس امر پر سب کا اجماع ہے کہ بیعت واجب نہیں۔

اب رہا دوسرا سوال کہ بیعت کے مشروع ہونے میں کیا حکمت ہے؟ سو تمہیں جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا دنیا میں یہ قانون جاری ہے کہ نفوسِ انسانی کے اندر جو نظر میں نہ آنے والی پوشیدہ کیفیات ہیں، اُس نے اُن کو ظاہری افعال و اقوال کے ذریعہ ضبط میں رہنے کا دستور بنایا ہے اور ان ظاہری افعال و اقوال ہی کو اندرونی نفسی کیفیات کا قائم مقام مقرر فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر خدا، خدا کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا نفس کی ایک نظر نہ آنے والی اندرونی کیفیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے زبان سے اقرار کرنے کو ظاہر میں اس کا قائم مقام بنایا ہے۔ اسی طرح دو آدمیوں کا کسی چیز کی خرید و فروخت کے متعلق متفق ہونا ایک مخفی معاملہ ہے، لیکن خریدار اور فروخت کرنے والے کا زبان سے ایجاب و قبول کرنا اُس کا ظاہر میں قائم مقام بن گیا۔ یہی مثال بیعت کی بھی ہے۔ ایک آدمی توبہ کرتا اور ترکِ معاصی کا عہد کرتا ہے اور تقویٰ پر مضبوطی سے قائم رہنے کا تہیہ کرتا ہے تو یہ ایک نفس کی داخلی کیفیت ہوئی۔ اس نفسی کیفیت کا قائم مقام بیعت کو بنایا گیا ہے۔

تیسرا سوال: بیعت لینے والے مرشد کے لیے کیا ضروری شرائط ہیں؟ سو مرشد کے لیے ایک شرط تو یہ ہے کہ وہ قرآن اور سنت کا علم رکھتا ہو۔ قرآن اور سنت کے علم سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ اس میں درجۂ کمال پر فائز ہو۔ مُرشد کے لیے قرآن کا علم بس اتنا کافی ہے کہ اس نے تفسیر مدارک یا تفسیر

جلالین یا ان جیسی کوئی اور تفسیر پڑھی ہو۔ کسی عالم سے قرآن کی تحقیق کی ہو اور اس کے معانی حل کیے ہوں، مشکل الفاظ کو سمجھا ہو، اسباب نزول کا احاطہ کیا ہو اور اعراب، قصص اور اس سے جو متعلق مسائل ہیں، ان کا عالم ہو۔ مُرشد کے سنت کا عالم ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ حدیث کی ''المصابیح'' جیسی کتاب پڑھ چکا ہو، اُس نے اس میں تحقیق کی ہو، اس کی معانی سمجھا ہو، اُس کے غریب و نامانوس الفاظ کی شرح کی ہو، اس کے مشکل اعراب کو حل کیا ہو اور حدیث میں جو دقیق مسئلہ آیا ہو، فقہاء میں سے کسی ایک کی رائے کے مطابق اُس نے اس کی تاویل وتشریح کی ہو۔ مُرشد کے لیے ضروری نہیں کہ وہ قران کا حافظ ہی ہو اور نہ یہ لازمی ہے کہ اُس نے احادیث کی اسانید میں بڑی کرید کی ہو۔ کیا واقعہ نہیں کہ تابعین اور تبع تابعین منقطع اور مرسل حدیث بھی لے لیتے تھے۔ ہاں! اس ضمن میں اصل مقصود صرف اتنا ہے کہ اس امر کا حتی الامکان اُسے ظن غالب ہوجائے کہ اس حدیث کا سلسلۂ روایت رسول اللہ ﷺ تک پہنچ جاتا ہے۔

نیز مرشد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اصولِ فقہ، علم کلام، فقہ کی جزئیات اور اُن کے فتاویٰ کا عالم ہو۔ ہم نے بیعت لینے والے کے لیے علم کی شرط صرف اس لیے لگائی ہے کہ بیعت سے اصل غرض امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تسکینِ باطن کے حصول کی تلقین اور برائیوں کو دور کرنے اور اچھائیوں کے حاصل کرنے کی ترغیب و ارشاد سے ہے اور چونکہ بیعت کرنے والے مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تمام باتوں میں اپنے مرشد کی اطاعت کرے، اس لیے اگر مرشد عالم نہیں تو اُس سے ان امور کو سرانجام دینے کا کیسے تصوّر کیا جاسکتا ہے؟

تمام مشائخ اس امر میں متفق ہیں کہ جس شخص نے حدیثیں نہ لکھی ہوں اور قرآن نہ پڑھا ہو، وہ کبھی وعظ نہ کہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص ایک مدت تک متقی علماء کی صحبت میں بیٹھا ہو، اُن سے اس نے تربیت حاصل کی ہو، وہ حلال و حرام میں خوب پہچان کرنے والا ہو اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول سے اچھی طرح واقف ہو تو البتہ یہ چیزیں وعظ کہنے والے کے لیے کافی ہوسکتی ہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ مرشد کے لیے دوسری شرط اس کا عادل ہونا اور اس کا تقویٰ ہے۔ مرشد کو چاہیے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچے، صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے اور اس کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ وہ دنیا سے بے نیاز ہو، آخرت میں رغبت رکھتا ہو، جو اطاعت و عبادات ضروری اور مؤکد ہیں اور جو ذکر و اذکار صحیح احادیث میں مروی ہیں ان کا پابند ہو اور اس کا دل برابر اللہ سبحانہ سے تعلق رکھے اور اس کے لیے یادداشت ایک مستقل ملکہ بن جائے۔

مرشد کے لیے پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ ایک مدت دراز تک مشائخ کی صحبت میں رہا ہو اور اُن سے اُس نے تربیت پائی اور نورِ باطن اور تسکینِ قلب اخذ کی ہو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ایک بندھا ہوا نظام ہے کہ کوئی شخص فلاح نہیں پاسکتا جب تک وہ فلاح پانے والوں کو نہ دیکھے بھالے اور اُن سے نہ ملے جُلے۔ جس طرح کہ کوئی شخص علم حاصل نہیں کرسکتا، جب تک کہ وہ علماء کی صحبت میں نہ رہے۔ یہی دوسرے پیشوں میں بھی ہوتا ہے۔ نیز مُرشد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اُس سے کرامات اور خوارق ہی ظاہر ہوں یا وہ کسبِ معاش کو چھوڑ بیٹھے۔ کرامات اور خوارق تو ثمرہ ہوتے ہیں محض مجاہدات اور ریاضتوں کا اور یہ چیز شرطِ کمال نہیں ہے۔ اسی طرح کسبِ معاش کو چھوڑ بیٹھنا شریعت کے منافی ہے۔ اس ضمن میں ان لوگوں کے اعمال سے دھوکا نہ کھانا چاہیے جو مغلوب الاحوال ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں سلف سے جو طریقہ چلا آتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو بھی تھوڑا سا مل جائے، اس پر قناعت کرلی جائے اور جو شبہ کی چیزیں ہیں، ان سے بچا جائے۔

باقی رہا یہ سوال کے بیعت کرنے والے مرید کے لیے کیا کیا شرطیں ہیں تو اس بارے میں تمھیں جاننا چاہیے کہ بیعت کرنے والے مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ بالغ ہو، عاقل ہو، شوق و رغبت رکھنے والا ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک بچہ پیش کیا گیا کہ وہ آپؐ سے بیعت کرے۔ آپؐ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اس کے لیے برکت کی دعا کی اور اس سے بیعت نہ لی۔ بعض مشائخ تبرک اور نیک فالی کے خیال سے کم عمروں کی بیعت بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

اس بحث کا پانچواں مسئلہ کہ بیعت کو توڑنے اور اس کو پورا کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق تمھیں جاننا چاہیے کہ بیعت جو صوفیاء میں نسلاً بعد نسل چلی آتی ہے، اس کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک گناہوں سے توبہ کرنے کی بیعت ہوتی ہے، ایک بیعت صالحین کے سلسلے میں تبرک کے طور پر شریک ہونے کی ہے جیسے کہ احادیث کے راویوں میں تبرک کے خیال سے شامل ہوتے ہیں، اس لیے کہ اس میں برکت ہے۔ صوفیا کی بیعت کی تیسری قسم یہ ہے کہ احکام الٰہی کے لیے سب سے کنارہ کش ہونے، جن چیزوں سے اللہ نے منع فرمایا ہے، اُن کو ظاہراً و باطناً ترک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے دل کو وابستہ کرنے پر عزم بالجزم کیا جائے، اس کے لیے بیعت ہو۔

بیعت کی پہلی جو دو شکلیں ہیں، ان کو پورا کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ کبیرہ گناہوں سے بچا جائے، صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ ہو اور اطاعت و عبادات میں جو واجب ہیں یا جو چیزیں سنتِ مؤکدہ کا درجہ رکھتی ہیں، ان کی پابندی کی جائے۔ یہ تو ہوا بیعت کا ایفائے عہد۔ باقی رہا اُس کا توڑنا، سو اوپر کے اعمال بجا نہ لانا یہ نقضِ بیعت ہوگا۔ اس نوع کی تیسری شکل کا ایفا یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کے لیے دنیا سے کنارہ کشی کے عزم اور اللہ تعالیٰ کے منع کیے ہوئے کاموں سے بچنے کی سعی و کوشش پر مرید برابر قائم رہے، یہاں تک وہ سکینۂ قلب کے نور سے منور ہوجائے اور یہ نور اُس کے اندر بطور ایک عادت، خلق اور طبیعت کے ہوجائے۔ جب مرید اپنے اندر یہ حالت پیدا کرلے تو اُس وقت اُسے اُن چیزوں کے کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے، جو شریعت نے مباح قرار دی ہیں۔ وہ دنیاوی لذت سے مستفید ہوسکتا ہے اور اس قسم کے مشاغل جیسے تعلیم، دنیا اور قضا کا منصب ہے یا جن میں ایک لمبے عرصے تک مصروف رہنا پڑتا ہے وہ کرسکتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی کے عزم اور اللہ تعالیٰ کے منع کیے ہوئے کاموں سے بچنے کی سعی پر برابر قائم نہ رہنا، یہ اس بیعت کی خلاف ورزی اور عہد شکنی ہوگی۔

چھٹے سوال کے متعلق کہ کیا ایک یا ایک سے زیادہ عالموں سے ایک شخص کا ایک یا ایک سے زیادہ بیعت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے کہ آپؐ نے صحابہ سے بار بار بیعت لی۔ اسی طرح صوفیا کا بھی کئی بار بیعت لینا مذکور ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ ایک سے بیعت کرنے کے بعد پھر دوسرے سے بیعت کی جائے یا نہ کی جائے تو اس کی صورت یہ ہے کہ جس مرشد سے کہ پہلے بیعت کی ہے، اگر اس میں کوئی خلل ظاہر ہے تو دوسرے مرشد سے بیعت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح پہلے مرشد کی موت اور اس کے لاپتہ ہونے پر بھی دوسرے مرشد سے بیعت کی جاسکتی ہے۔ لیکن پہلی بیعت کو چھوڑ کر دوسرے مرشد سے بغیر کسی عذر کے بیعت کرنا، یہ تو ایک کھیل ہے۔ اس سے یہ ہوگا کہ بیعت میں برکت نہ رہے گی اور مرشدوں کا دل مرید کی خبر گیری سے ہٹ جائے گا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

اور یہ سوال کے بیعت کے کون سے الفاظ سلف سے منقول ہیں؟ اس کے متعلق تمھیں معلوم چاہیے کہ بیعت لیتے وقت مرشد کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے خطبۂ مسنونہ پڑھے

اور وہ یہ ہے: الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ والہ وصحبہ وبارک وسلم. اس خطبۂ مسنونہ کے بعد مرشد مرید کو ایمان اجمال کی تلقین کرے اور اس سے یوں کہلوائے:

"میں ایمان لایا اللہ پر اور جو اللہ کی طرف سے آیا اللہ کی مراد پر۔ میں ایمان لایا اللہ کے رسول پر اور جو کچھ اللہ کے رسول سے آیا اللہ کے رسول کی مراد پر۔ میں نے تمام مذاہب اور تمام گناہوں سے برأت کی اور اس وقت اور اب اسلام لایا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔"

اس کے بعد مرشد، مرید سے کہے کہ: "میں بیعت کرتا ہوں رسول اللہ ﷺ کی آپ کے خلفا کے توسط سے ان پانچ چیزوں پر (۱) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ اُس کے رسول ہیں۔ (۲) نماز کا قیام (۳) ادائے زکوٰۃ (۴) رمضان کے روزے (۵) زادِ راہ کے استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج۔" پھر مرید سے یوں کہلوائے: "میں رسول اللہ ﷺ کی آپؐ کی خلفا سے واسطے سے اس بات پر بیعت کرتا ہوں کہ میں اللہ کے ساتھ شرک نہیں کروں گا، نہ چوری کروں گا، نہ زنا، نہ کسی پر جھوٹا بہتان لگاؤں گا اور نیک کاموں میں اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔" اس کے بعد مرشد یہ دو آیتیں تلاوت کرے: یایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدو فی سبیلہ لعلکم تفلحون ان اللذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکث علیٰ نفسہ ومن اوفیٰ بما عاھد علیہ اللہ فسیؤتیہ اجرا عظیما. پھر مرشد اپنے لیے، مرید کے لیے اور جو حاضرین ہوں ان کے لیے دعائے خیر کرے اور پھر کہے: "اللہ تعالیٰ برکت دے ہمیں اور تم کو اور نفع دے ہمیں اور تم لوگوں کو۔"

بیعت لیتے وقت اگر مرشد مُرید سے یہ کہلوائے کہ: "میں نے نقشبندی طریقہ جو شیخ اعظم قطب اُمم خواجہ نقشبند کی طرف یا قادری طریقہ جو شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی طرف یا چشتی طریقہ جو شیخ معین الدین سنجری کی طرف منسوب ہے، اختیار کیا ہے۔ اے اللہ! ہمیں اس طریقے کی فتوح عطا فرما اور تو اپنی رحمت سے اس طریقے کے زمرۂ اولیا میں ہمیں شامل کر۔ اے سب سے زیادہ رحمت کرنے والے!" تو اس طرح کہلوانے میں کوئی حرج نہیں۔

میرے والد شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں: "میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ کی میں نے بیعت کی اور آپؐ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ چنانچہ اب میں جب کسی سے بیعت لیتا ہوں تو اسی طرح اس کے ہاتھ کا مصافحہ کرتا ہوں۔" عورتوں سے بیعت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ مرشد کپڑے کا ایک کنارہ پکڑے اور جو عورت بیعت کرنا چاہتی ہو، وہ اس کا دوسرا کنارہ پکڑے۔ باقی خدا بہتر جانتا ہے۔

مرید کی تعلیم و تربیت:

سالکوں کی تربیت کے مختلف درجے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف توجہ کرنی چاہیے، وہ سالک کا عقیدہ ہے۔ جب مرید اللہ کے راستے پر چلنے کی طرف راغب ہو تو مرشد اس کو حکم دے کہ سب سے پہلے وہ سلف صالحین کے مطابق اپنی عقاید کی تصحیح کرے۔ یعنی وہ ذات واجب الوجود کو اس طرح مانے کہ کوئی معبود نہیں اس کے سوا اور حیات، علم، قدرت، ارادہ اور اس طرح کی جو صفات ہیں، ان سب کا جو درجۂ کمال ہے، وہ ذات واجب الوجود اُن سے متصف ہے۔ مرید اللہ کے لیے ان صفات کمال کو اسی طرح مانے جس طرح خود اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے لیے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے اور جس طرح صحیح احادیث و روایات سے یہ صفات الٰہی رسول اللہ ﷺ سے جو صحیح خبر دینے والے ہیں اور آپؐ کی آل، آپؐ کے اصحاب

اور آپؐ کے تابعین سے ثابت ہیں۔ نیز وہ ذات واجب الوجود کو نقص اور زوال کے ان تمام عیوب سے جیسے کہ جسمیت، کسی خاص جگہ میں محدود ہونا، عرض ہونا، کسی خاص طرف، کسی خاص رنگ اور کسی خاص شکل سے متصف ہونا وغیرہ ہیں، منزہ مانے۔

صفاتِ الٰہی کے ضمن میں قرآن میں ذاتِ واجب الوجود کے متعلق استواعلی العرش، ضحک یعنی ہنسی اور اثباتِ ید یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں، اس طرح کی جو چیزیں وارد ہوئی ہیں، ہم مجملاً ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی تفصیل ہم اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اتنا ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ اُس ذات کا اپنے آپ کو استوار علی العرش سے متصف کرنا اس طرح نہیں جس طرح کہ ہم کسی کو اس صفت سے متصف کریں، کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا کے مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سب کچھ سنتا اور دیکھا ہے جیسے کہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے: لیس کمثلہ شیء وھو السمیع العلیم۔ پھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا استواء علی العرش ہونا خود اپنی محکم کتاب میں ثابت کیا ہے۔ اس لیے ہم اس کا استوا علی العرش ہونا مانتے ہیں۔

ذات واجب الوجود کو اس طرح ماننے کے بعد مرید کو چاہیے کہ وہ تمام انبیا کی نبوت کا بالعموم اور سیدنا ومولانا محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کا بالخصوص یقین و اثبات کرے۔ آپؐ نے خدا کی طرف سے جو کچھ کرنے کا حکم دیا ہے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے، ان سب میں آپؐ کی اتباع کو واجب سمجھے اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی صفات جس طرح بیان فرمائی ہیں، اور موت کے بعد دوسری زندگی میں انسانوں کا جسموں کے ساتھ زندہ ہونا، جنت، دوزخ، حشر، حساب، رویت الٰہی، قیامت، عذاب قبر اور اس طرح کی اور چیزیں جو روایات سے ثابت ہیں اور صحیح احادیث میں ان کا ذکر آیا ہے، مرید ان سب باتوں کی تصدیق کرے۔

تصحیح عقاید اور ثباتِ نبوّت کے بعد مرید کو کبیرہ گناہوں سے بچنے اور صغیرہ گناہوں کے ارتکاب پر نادم ہونے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ کبیرہ گناہوں کی حقیقت یہ ہے کہ وہ گناہ جن کے متعلق قرآن اور اُن کی احادیث میں جو کہ علمائے حدیث کے نزدیک معروف و مشہور ہیں، دوزخ اور سخت عذاب کی وعید دی گئی ہے یا اُس کے مرتکب کو کافر بتایا گیا ہے، گناہ کبیرہ ہیں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی وہ کافر ہوا۔'' یا آپؐ کا یہ ارشاد کہ: ''ہمارے اور مشرکین کے درمیان اگر کوئی فرق کرنے والی چیز ہے تو وہ نماز ہے۔ چنانچہ جس نے نماز کو ترک کیا وہ کافر ہوا۔'' نیز وہ گناہ جن کے ارتکاب پر شریعت کی طرف سے حدّ مقرر ہے، جیسے زنا، چوری، رہزنی، شراب پینا یا ان کی طرح کے اور گناہ جن کو عقل صریح طور سے برائی میں مذکورہ بالا گناہوں کے مساوی یا اُن سے بڑھا ہوا سمجھے، یہ سب کے سب کبیرہ گناہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی اور کو شریک کرنا اور رزق، شفا اور اس طرح کے کاموں میں اللہ کے سوا اوروں سے مدد مانگنا، ان کا شمار بھی کبیرہ گناہوں میں ہوتا ہے، چنانچہ سورۂ فاتحہ کی آیت: ''ایاک نعبد وایاک نستعین'' میں اسی شرک فی العبادت اور شرک فی الاستعانت سے برأت کا اظہار کیا گیا ہے۔

کبیرہ گناہوں میں سے ایک کاہن کی بات کی تصدیق کرنا بھی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ، قرآن مجید اور فرشتوں کو گالی دینا، ان کا انکار کرنا، اُن کا مذاق اڑانا اور ضروریاتِ دین کا انکار کرنا، نیز نماز کو ترک کرنا، زکوٰۃ نہ دینا، روزے نہ رکھنا، استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا، بغیر وجۂ حق کے کسی کو مار ڈالنا، اولاد کو قتل کرنا، خود اپنی جان لینا، زنا، لواطت، نشے والی چیز پینا، چوری، رہزنی، کسی کا مال غصب کرلینا، خیانت کرنا، جھوٹی شہادت دینا، جھوٹی قسم کھانا، پاکدامن عورت پر بہتان لگانا، یتیم کا مال کھانا، والدین کی